آگے فرماتے ہیں :

"انبیاء جو تزکیہ کرتے ہیں اس میں دونوں باتیں ہوتی ہیں، وہ اعمال و اخلاق کو غلط چیزوں سے پاک کرتے ہیں اور ان کے اعمال و اخلاق کو نشو و نما دے کر مفاسد کے بالمقابل استقامت کی قوت بھی پیدا کرتے ہیں۔ (تدبر، صـ۲۹۸، ج ۱)

اس موقع پر ایک سوال ضرور سامنے آتا ہے کہ سیدنا ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی دعا میں پہلے تلاوت آیات کا ذکر ہے، پھر تعلیم کتاب و حکمت اور آخر میں تزکیہ، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تین مقامات پر بعثت نبوی کا مختلف انداز سے جو ذکر فرمایا اس میں ترتیب میں البتہ فرق ہے، اصولاً باتیں وہی ہیں ـــــ ترتیب میں آیات کی تلاوت کے بعد "تزکیہ" کا ذکر آیا پھر تعلیم کتاب و حکمت کا ـــــ ایسا کیوں؟

اصل تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی عمل و ارشاد پر ہمیں "کیوں" کا حق ہی نہیں، تاہم اس میں جو خاص رمز و اشارہ ہے یا اس کی جو حکمت ہے اس کی غرض سے یہ سوال سامنے آیا۔ تو اس کا جواب کچھ اس طرح ہے کہ انسانی شخصیت، فکر و عمل کے مجموعہ کا نام ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ غلط فکر سے غلط عمل ہی جنم لے گا جبکہ صحیح عمل کے لئے تصحیح فکر لازمی ہے۔ فکر صحیح ہو جائے تو غلط خیالات و فاسد افکار از خود دور ہو جائیں گے، قرآن عزیز کا اصل "فلسفۂ تزکیہ" یہی ہے، جس کے لیے مصنوعی تدابیر کی چنداں ضرورت نہیں (جس کا ذکر آئندہ چل کر حکیم امت تھانوی قدس سرہ کے حوالہ سے آ رہا ہے) بلکہ تزکیۂ عمل لازمی نتیجہ ہے تطہیر فکر کا اور وہ فطری ثمرہ ہے تلاوت آیات کا، اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے اصطلاحات اربعہ میں تلاوت سے بعد معاً تزکیہ کا ذکر کیا ـــــ بقول مولانا اصلاحی:

"پس تلاوت آیات کے بعد مذکورہ بالا آیات میں تزکیہ کا ذکر آ رہا ہے۔ تو یہ درحقیقت نتیجہ ہے تلاوت آیات کا، اللہ کی آیات کی تلاوت سے انسان کے دل سے باطل خیالات و عقائد کی جڑیں جب کٹ جاتی ہیں تو اس کے دل کی زمین صحیح خیالات و عقائد کی تخم ریزی کے لئے بالکل پاک و صاف ہو جاتی ہے۔

(مبادی تدبر قرآن صـ۹۰ - ۸۹)

اور پھر ایسے دل میں تعلیم کتاب و حکمت اپنے اصل برگ و بار پیدا کرتی ہے اور پھر انسان صحیح معنوں میں "عبداللہ" (اللہ کا بندہ) بن جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں مختصر بحث "نبی اکرم علیہ السلام کا مقصد بعثت" (ڈاکٹر اسرار احمد صاحب) نامی

کتابچہ میں ملاحظہ فرمالیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو مولانا عبدالباری ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ خلیفہ حضرت حکیم امت تھانوی قدس سرہٗ کی کتاب "تجدید تصوف وسلوک" دیکھ لیں۔

نبی مکرم علیہ السلام دنیا سے رخصت ہوگئے لیکن دین کی امانت امت کے سپرد کر گئے۔ اور "حجۃ الوداع" کے موقع پر "فلیبلغ الشاھد الغائب" کی نصیحت وحکم بھی فرما گئے۔ امت کے رجال دین نے اس امانت کی جس طرح حفاظت کی اور اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا وہ بلاشبہ ہماری تاریخ کا روشن باب ہے، لیکن اس وقت اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں۔ اس وقت گفتگو اس رخ پر ہے جس کا تعلق "تزکیہ" سے ہے۔ صدیوں سے اس خاص مقصد کی غرض سے "تصوف" کی اصطلاح چل رہی ہے اور مختلف لوگ اس معاملہ میں افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ یہ بات اہل دین اور بالخصوص مقصدیت کے حامل افراد کے لئے مناسب نہیں، ان کی توجہ اور نظر ہمیشہ مقصد پر رہنی چاہیئے اور ان میں یہ احساس بیدار رہنا لازم ہے کہ دل کا معاملہ سب سے زیادہ نازک ہے۔ اور اس کی اصلاح بے حد ضروری ہے، ورنہ کوئی کام نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا۔

تصوف کیا ہے؟ یہ اصطلاح کب سے شروع ہوئی، اس کا موجد کون ہے۔ اس انداز کے سوال وہ لوگ تو کر سکتے ہیں جنہیں زندگی میں صرف نظریاتی بحثوں میں وقت گزارنا ہے۔ اور جن کے پیش نظر کام ہے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرتے بلکہ جہد وسعی میں لگے رہتے ہیں ـــــ تاہم ایک مخلصانہ مشورہ کے طور پر اتنی گذارش کرنے میں حرج نہیں کہ دین اسلام، دین قیم ہے۔ اس میں کسی قسم کی کمی یا اعوجاج (ٹیڑھاپن) نہیں۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول، سید کائنات محمد عربی علیہ السلام کے ذریعے مکمل شکل میں ہمارے سپرد فرمایا ـــــ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ حضور اکرم علیہ السلام کے مقاصد بعثت یا دوسرے لفظوں میں فرائض نبوت میں ایک اہم مقصد وفرض "تزکیہ" ہے۔ اس کا جو مفہوم ومعنی ہے وہ بھی مختصراً سامنے آچکا ہے۔ اس کی نہایت خوبصورت ترجمانی "حدیث جبریل" میں ہے جب سیدنا جبریل علیہ السلام حضرت نبی کریم علیہ السلام سے سوال کرتے ہیں:

فاخبرنی عن الاحسان؟

"احسان" سے مراد بقول حضرت ملا علی القاری رحمہ اللہ تعالیٰ "اخلاص" ہے جو شرط ہے، ایمان واسلام کی صحت کے لئے "ـــــ بلکہ چند لفظ بعد "القاریؒ" فرماتے ہیں:

والاظہر ان المراد بہ احسان العمل وھو احکامہ واتقانہ وھو یشتمل الاخلاص ومافوقہ من مرتبۃ الحضور مع اللہ ونفی

الشعور عما سواہ (صہ۵۹ ج ۱)

یعنی "واضح اور ظاہر معنی یہ ہے کہ اس سے مراد" احسانِ عمل " ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی اور اس سے ڈرنا ہے اور یہ اخلاص پر ہی مشتمل نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ مرتبہ حضوری اور اس کے ماسوا کی نفی پر بھی مشتمل ہے۔"

اس سوال کے جواب میں حضور علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا وہ بھی اسی کی دلیل ہے ۔

ارشاد ہے :

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔

یعنی تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو ورنہ کم از کم یہ تو یقین رہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے ۔

اہلِ تزکیہ و احسان (صوفیاء) عبادت کا معنی کرتے ہیں :

ان العبادۃ حفظ الحدود والوفا بالعھود وقطع العلائق والشرکاء عن شرک والفناء عن مشاھدتک فی مشاھدۃ الحق ـــــ الخ،

(مرقات صہ۶۰ ج ۱)

حدود الٰہی کی حفاظت، عہد و پیمان کو پورا کرنے، ماسوی اللہ کے تعلقات اور شرکاء کے شرک کو قطع کرنے، اپنی شخصیت و مشاہدہ کو حضرت حق کے مشاہدہ اور اس کی عظمت میں فنا کر دینے کا نام عبادت ہے ۔

اس مختصر تشریح سے " مقصد تزکیہ " خوب واضح ہو جاتا ہے اور یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ اس تزکیہ کا مقصد " احسان " یعنی اخلاص اور حضوریٔ قلب کی شکل میں سامنے آتا ہے، وہی مقصود ہے اور اسی کے حصول پر پورے عمل و کردار کی اصلاح کا دار و مدار ہے ـــــ اس لئے ایسے محققین اہلِ صدق و صفا کی کمی نہیں جو اس جدید اصطلاح "تصوّف" کے بجائے " احسان " ہی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے سنّت سے ثابت اعمال و اصطلاحات کی اہمیت، برکت اور عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے اسی اصطلاح یعنی " احسان " کو اپنا لیا جائے تو بڑا ہی مفید ہے۔ ایسا کرنے سے " بدعت " کے سبب جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور جس طرح " نورِ سنّت " سے محرومی ہوتی ہے، اس سے بھی ہم بچ جائیں گے۔ اور سنّتِ مقدسہ کی ترویج و اشاعت اور اس کے " زندہ " کرنے کا ثواب حاصل کر پائیں گے ۔ جو ایک بندۂ مومن کا طرۂ امتیاز ہے

قریبی دور کے "اہل احسان" میں حکیم امت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ ایک بہت بڑے انسان ہوگزرے ہیں، جنکی اردو زبان کی تفسیر "بیان القرآن" کو دیکھ کر امیر المؤمنین فی الحدیث مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اس تفسیر کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اردو کا دامن بھی علم سے خالی نہیں۔ اور یہی مولانا تھانوی تھے کہ سید الملتہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جب ان سے بیعت طریقت کی تو پھر ان کا رنگ ہی بدل گیا، حتیٰ کہ راولپنڈی میں میرے ایک مرحوم بزرگ حافظ ریاض احمد اشرفی کے ذخیرہ میں ان کا ایک خط موجود ہے جس میں انہوں نے اپنے بہت سے "تفردات" سے رجوع کیا اور یہ لکھا کہ جس سلیمان کو آپ تلاش کر رہے ہیں، مدت ہوئی وہ مرگیا۔

انہی مولانا تھانوی کی مجلسی گفتگوؤں کا ایک مجموعہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے ذمہ دار بزرگ کا مرتب کردہ موجود ہے۔ اس میں ایسے ہی مسائل کے ضمن میں مولانا فرماتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ جو چیز انسان کے لیے جتنی زیادہ ضروری ہے اس کا حصول اتنا ہی سہل اور آسان بنا دیا گیا ہے، سب سے زیادہ ضرورت ہوا کی ہے وہ ہر جگہ ہر وقت مفت ملتی ہے بلکہ ایک درجہ میں جبراً ملتی ہے کہ اگر کوئی شخص اس سے بچنا چاہے تو بچ نہ سکے .... اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا یہ عام نفع کی چیز ہے، اس کی ہر کسی کو ضرورت ہے۔ فطرۃً اس کا آسان ہونا لازمی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگوں کے غلو نے اسے مشکل بنا دیا اور غیر ضروری اصول و اعمال کو تصوف سمجھ لیا۔ حالانکہ تصوف کچھ اور ہی ہے، وہ تو فقط توجہ الی اللہ ہے جس میں اس یقین کا ہونا ضروری ہے کہ ہم توجہ کریں گے تو وہ ہم سے زیادہ توجہ کرے گا (جیسا کہ حدیث میں ہے) اس میں کسی نفلی عمل کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ تکمیل فرائض ضروری ہے ــــ اس سلسلہ میں مسند احمد میں ایک روایت بھی ہے کہ کسی نے کسی سے متعلق کہا انی لَاَبْغَضُ ھٰذا ؟ تو انہوں نے پلٹ کر پوچھا اس بغض کا سبب؟ انہوں نے کہا کہ میں نے انہیں کبھی نفلی نماز وغیرہ میں مشغول نہیں دیکھا، انہوں نے کہا آپ نے مجھ سے کبھی فرائض میں کوتاہی دیکھی؟ کہا نہیں ــــ فرمایا بس میں اتنا ہی کافی سمجھتا ہوں اور پھر وہ دونوں پیغمبرِ اقدس کے حضور گئے تو آپ نے ان کی تصویب فرمائی کہ یہ درست کہتے ہیں۔ (صہ ۲۰۰، ۲۰۱)

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "اصولِ تصوف" محض یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یاد ہو اور احکامِ شرعیہ

کا اہتمام، اس کے علاوہ جو اشغال ہیں وہ ضرورۃً ہیں۔ اس طریق کا جزو نہیں۔ (ص۲۱۶)

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ:

"طریقت اور تصوف نام ہے شریعت پر مکمل اور پورے پورے عمل کا (اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً (الآیہ - البقرہ) اعمالِ ظاہرہ کی طرح اعمالِ باطنہ بھی ہیں اور ان کی اصلاح بھی لازم ہے، اس میں سب سے پہلے عقائد کی درستی ہے پھر اخلاق کی اصلاح، تکبر، حسد، بغض، حرص، حبِ جاہ و مال سے بچنا، تواضع، قناعت، صبر، شکر، اللہ تعالیٰ سے محبت، اللہ کے رسولؐ کی کامل اطاعت، ان کو حاصل کرنا یہی ساری طریقت و تصوف ہے۔"

امام شعرانی رحمہ اللہ تعالیٰ "الیواقیت والجواہر" میں لکھتے ہیں کہ اعمال باطنہ اور ان کے احکام "فقہ اسلامی" کا باقاعدہ حصہ تھے لیکن کتبِ فقہ میں ان کی تدوین اس لئے نہ ہوئی کہ عموماً ان کا اہتمام ہر مسلم گھرانے میں موجود تھا۔ اور کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ان سے واقف نہ ہو اور ان پر عامل نہ ہو، بعد میں جب لوگ غفلت کا شکار ہو گئے۔ تو اس کی تدوین بطور ایک فن کے ہو گئی اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے نبی امی علیہ السلام کے زمانہ میں حدیث وفقہ کی تدوین نہ تھی۔ بعد میں ضرورت پر اس کا اہتمام ہوا۔

المختصر: اعمالِ باطنہ کے احکام کتبِ فقہ میں مدوّن نہ ہونے سے یہ دھوکا کھانا صحیح نہیں کہ یہ شرعی احکام نہیں یا ان کی اہمیت نماز روزہ سے کم ہے ــــ نہیں بلکہ ان کی اہمیت اسی طرح ہے بلکہ بعض حالتوں میں ان سے بڑھ کر۔ (ص ۱۴۰)

ایک جگہ فرمایا کہ میرے نزدیک صوفی کی تعریف "عالم باعمل" ہے۔ باقی جو باتیں ہیں وہ تعریف کا جزو نہیں، اس کے ثمرات ہیں (ص ۳۰۲)

جس طرح زندگی کے کسی میدان میں بھی کوئی شخص اپنے استاد کی عظمت، احترام اور اس کی قدردانی کے بغیر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا، اسی طرح اس راہ کے جو مرد میدان ہیں، ان کی صحبت، احترام اور ان سے محبت و تعلق لازم ہے ورنہ کوئی تعلیم و تلقین کارگر نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت مولانا ومقتدانا السید محمد اسمٰعیل شہید دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے "منصبِ امامت" میں لکھا ہے کہ:

بزرگوں (مشائخ) کا فیض صحبتِ آفتاب کے مشابہ ہے کہ اس کا فائدہ سبھی کو ہوتا ہے استفادہ کرنے والے کو اس کی خبر ہو یا نہ ہو اور وہ استفادہ کا قصد کرے یا نہ کرے۔

قریبی دور کے "اہل احسان" میں حکیم امت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ ایک بہت بڑے انسان ہو گذرے ہیں، جنکی اردو زبان کی تفسیر "بیان القرآن" کو دیکھ کر امیر المؤمنین فی الحدیث مولانا سید محمد انورشاہ کاشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اس تفسیر کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اردو کا دامن بھی علم سے خالی نہیں۔ اور یہی مولانا تھانوی تھے کہ سید الملۃ مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جب ان سے بیعت طریقت کی تو پھر ان کا رنگ ہی بدل گیا، حتٰی کہ راولپنڈی میں میرے ایک مرحوم بزرگ حافظ ریاض احمد اشرفی کے ذخیرہ میں ان کا ایک خط موجود ہے جس میں انہوں نے اپنے بہت سے "تفرّدات" سے رجوع کیا اور یہ لکھا کہ جس سلیمان کو آپ تلاش کر رہے ہیں، مدت ہوئی وہ مر گیا۔

انہی مولانا تھانوی کی مجلسی گفتگوؤں کا ایک مجموعہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے ذمہ دار بزرگ کا مرتب کردہ موجود ہے۔ اس میں ایسے ہی مسائل کے ضمن میں مولانا فرماتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ جو چیز انسان کے لیے جتنی زیادہ ضروری ہے اس کا حصول اتنا ہی سہل اور آسان بنا دیا گیا ہے، سب سے زیادہ ضرورت ہوا کی ہے وہ ہر جگہ ہر وقت مفت ملتی ہے بلکہ ایک درجہ میں جبرًا ملتی ہے کہ اگر کوئی شخص اس سے بچنا چاہے تو بچ نہ سکے .... اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا یہ عام نفع کی چیز ہے، اس کی ہر کسی کو ضرورت ہے۔ فطرۃً اس کا آسان ہونا لازمی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگوں کے غلو نے اسے مشکل بنا دیا اور غیر ضروری اصول و اعمال کو تصوّف سمجھ لیا۔ حالانکہ تصوّف کچھ اور ہی ہے، وہ تو فقط توجہ الی اللہ ہے جس میں اس یقین کا ہونا ضروری ہے کہ ہم توجہ کریں گے تو وہ ہم سے زیادہ توجّہ کرے گا (جیسا کہ حدیث میں ہے) اس میں کسی نفلی عمل کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ تکمیل فرائض ضروری ہے ــــ اس سلسلہ میں مسند احمد میں ایک روایت بھی ہے کہ کسی نے کسی سے متعلق کہا اِنی لَاَبْغَضُ ھٰذا ؟ تو انہوں نے پلٹ کر پوچھا اس بغض کا سبب؟ انہوں نے کہا کہ میں نے تمہیں کبھی نفلی نماز وغیرہ میں مشغول نہیں دیکھا، انہوں نے کہا آپ نے مجھ سے کبھی فرائض میں کوتاہی دیکھی؟ کہا نہیں ــــ فرمایا بس میں اتنا ہی کافی سمجھتا ہوں اور پھر وہ دونوں پیغمبر اقدس کے حضور گئے تو آپ نے ان کی تصویب فرمائی کہ یہ درست کہتے ہیں۔ (صہ ۲۰۰، ۲۰۱)

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "اصولِ تصوّف" محض یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یاد ہو اور احکام شرعیہ

کا اہتمام، اس کے علاوہ جو اشغال ہیں وہ ضرورۃً ہیں۔ اس طریق کا جزو نہیں۔ (ص۲۱۶)

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ:

”طریقت اور تصوّف نام ہے شریعت پر مکمل اور پورے پورے عمل کا (اُدْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً (الآیہ - البقرہ) اعمالِ ظاہرہ کی طرح اعمالِ باطنہ بھی ہیں اور ان کی اصلاح بھی لازم ہے، اس میں سب سے پہلے عقائد کی درستی ہے پھر اخلاق کی اصلاح، تکبر، حسد، بغض، حرص، حب جاہ و مال سے بچنا، تواضع، قناعت، صبر، شکر، اللہ تعالیٰ سے محبت، اللہ کے رسولؐ کی کامل اطاعت، ان کو حاصل کرنا یہی ساری طریقت و تصوف ہے۔“

امام شعرانی رحمہ اللہ تعالیٰ ”الیواقیت والجواہر“ میں لکھتے ہیں کہ اعمال باطنہ اور ان کے احکام ”فقہ اسلامی“ کا باقاعدہ حصہ تھے لیکن کتبِ فقہ میں ان کی تدوین اس لئے نہ ہوئی کہ عموماً ان کا اہتمام ہر مسلم گھرانے میں موجود تھا۔ اور کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ان سے واقف نہ ہو اور ان پر عامل نہ ہو، بعد میں جب لوگ غفلت کا شکار ہو گئے۔ تو اس کی تدوین بطور ایک فن کے ہو گئی اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے نبی امی علیہ السلام کے زمانہ میں حدیث و فقہ کی تدوین نہ تھی۔ بعد میں ضرورت پر اس کا اہتمام ہوا۔

الملخص: اعمالِ باطنہ کے احکام کتب فقہ میں مدوّن نہ ہونے سے یہ دھوکا کھانا صحیح نہیں کہ یہ شرعی احکام نہیں یا ان کی اہمیت نماز روزہ سے کم ہے ـــ نہیں بلکہ ان کی اہمیت اسی طرح ہے بلکہ بعض حالتوں میں ان سے بڑھ کر۔ (ص۱۴۰)

ایک جگہ فرمایا کہ میرے نزدیک صوفی کی تعریف ”عالم باعمل“ ہے۔ باقی جو باتیں ہیں وہ تعریف کا جزو نہیں، اس کے ثمرات ہیں (ص۳۰۲)

جس طرح زندگی کے کسی میدان میں بھی کوئی شخص اپنے استاد کی عظمت، احترام اور اس کی قدردانی کے بغیر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا، اسی طرح اس راہ کے جو مرد میدان ہیں، ان کی صحبت، احترام اور ان سے محبت و تعلق لازم ہے ورنہ کوئی تعلیم و تلقین کارگر نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت مولانا و مقتدانا السید محمد اسمٰعیل شہید دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ”منصبِ امامت“ میں لکھا ہے کہ:

بزرگوں (مشائخ) کا فیض صحبتِ آفتاب کے مشابہ ہے کہ اس کا فائدہ سبھی کو ہوتا ہے استفادہ کرنے والے کو اس کی خبر ہو یا نہ ہو اور وہ استفادہ کا قصد کرے یا نہ کرے۔

یہی حال بزرگانِ دین اور مشائخ کا ہے اور ایسے حضرات کی علامت یہ ہوتی ہے کہ جب آدمی ان سے دور ہوتا یا ان کی وفات ہوتی ہے تو قلوب میں ایک طرح کی ظلمت محسوس ہوتی ہے۔

اس پر مولانا تھانوی نے ایک روایت سے استشہاد بھی کیا ہے کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے سرورِ کائنات علیہ السلام کی وفات پر کہا :

وَاللّٰہُ مَا اَفْضَنَا اَھْدَ یْنَا مِنَ التُّرَابِ حَتّٰی اَنْکَرَنَا قُلُوْبَنَا

کہ رسول اکرم علیہ السّلام کی تدفین کرکے ہم نے مٹی سے ہاتھ بھی نہ جھاڑے تھے کہ ہمارے قلوب میں تغیر محسوس ہونے لگا۔ (ص ۱۰۸-۱۰۷)

اور اسی کی تائید میں وہ روایت بھی ہے جس میں حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے "نفاق" کا خدشہ ظاہر کیا، اس پر حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا خیریت تو ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ صحبتِ نبوی میں اور کیفیت ہوتی ہے، وہاں سے علیحدگی پر حال ہی بدل جاتا ہے۔ ـــــ تو سیدنا صدیق چونک پڑے، فرمایا، میرا بھی یہی حال ہے اور پھر دونوں خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ اور سارا واقعہ عرض کیا تو رسول اکرم علیہ السّلام نے تسلی دلائی کہ میری صحبت و معیت میں جو کیفیت تمہیں حاصل ہوتی ہے اگر سدا وہی رہے تو مدینہ کی گلیوں میں اللہ تعالیٰ کے فرشتے تم سے مصافحے کرتے پھریں۔ ـــــ اور ایسے ہی اہل کمال کے متعلق فرمایا گیا کہ

"اللہ والے وہ ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آجائیں" (حدیثِ نبوی)

اس راہ کے مسافر، تین خوبیوں سے متصف ہوں تو وہ کامل شمار ہوتے ہیں اور اس قابل کہ وہ دوسروں کے قلوب کی صفائی کا اہتمام کریں۔ حضرت شیخ الاسلام بابا فرید الحق دھنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب خادم خواجہ نظام الدین بدایونی ثم دہلوی کو جب دہلی روانہ فرمایا کہ تغلق آباد (دہلی) میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کرو تو ساتھ ہی فرمایا:

"باری تعالیٰ ترا علم و عقل و عشق عطا فرمودہ است و ہر کہ بایں سہ صفات متصف باشد خرقہ خلافت او را نیکو آید (فوائد الفوائد)

اس میں جن تین خوبیوں کا ذکر ہے اور جن کے حامل کو ہم نے "کامل" کہا، انمیں پہلا وصف اور پہلی خوبی "علم" ہے جس کا حصول و طلب اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نے ہر مسلمان کے لئے لازم قرار دیا

"طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم"

حاملینِ علم کے لئے ارشاد ہے:

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (الفاطر ۲۸)

"اللہ سے اس کے بندوں میں سے عالم ہی ڈرتے ہیں"

حاملینِ علم کے لئے ارشاد ہے:

اور يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ

(المجادلہ: ۱۱)

تم میں سے اللہ ایمانداروں کے اور ان کے جنہیں علم دیا گیا، درجے بلند کرے گا۔

علم میں "علم کسبی" کے ساتھ "علم وہبی ولدنّی" بھی شامل ہے۔ جسے حضرت الامام الشافعی قدس سرہ نے "اللہ تعالیٰ کے نور" سے تعبیر فرمایا:

شکوت الی وکیع سوء حفظی فاوصانی الی ترک المعاصی

فان العلم نور من الٰہٖ و نور اللہ لا یعطی لعاصی

اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ان دونوں کی تعبیر "معلومات اور ذوق" سے فرمائی۔

دوسری صفت عقل ہے۔ یعنی وہ قوت جس کے ذریعے ایک انسان اشیاء کے حقائق و خواص کا ادراک کرتا ہے۔ اور درجۂ آخر میں اس سے مراد "عقلِ سلیم" ہے جو اپنے عمل میں غلطی نہیں کرتی اور بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ قرآن میں جہاں بھی "عقل" کا لفظ آیا ہے، وہاں "عقلِ سلیم" ہی مراد ہے۔ آخر مشرکوں کو بے عقل کیوں کہا گیا! کیا وہ معمول کی عقل سے بھی محروم تھے، نہیں بلکہ "عقلِ سلیم" سے محروم تھے۔

تیسری صفت "عشق" ہے۔ جس سے آسان لفظوں میں مراد حقیقتِ مطلقہ یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس سے وہ تعلق ہے جس کا تقاضا وہ ہم سے کرتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ: ۱۶۵)

اور ایمان والوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔

حدیثِ جبریلؑ جس کا حوالہ پہلے گذر چکا ہے اس میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ مشاہدہ حق میں اتنا غرق ہو جاؤ اور تمہاری روح یادِ الٰہی میں اس طرح ڈوب جائے کہ بس وہی ہر وقت تمہارے سامنے

اقبال مرحوم نے اپنے فارسی و اردو کلام میں اس طرف بہت اچھے اشارے کئے:

من بندۂ آزادم عشق است امام من عشق است امام من عقل است غلام من

ہنگامۂ ایں محفل از گردشِ جامِ من ایں کوکبِ شامِ من ، ایں ماہ تمامِ من
جانی در عدم آسودہ بے ذوقِ تمنا بود مستانہ نواہا زد در حلقۂ دامِ من

واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ کیفیت حاصل ہے تو علم، حکمت، عبادت، ریاضت سبھی معتبر ہیں، ورنہ محض دھوکہ! بقول اقبال مرحوم

شہیدِ محبت نہ کافر نہ غازی محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی
یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے !! تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی
نہ محتاجِ سلطان، نہ مرعوبِ سلطان محبت ہے آزادی و بے نیازی

"قلب" کو جو اہمیت ہے اس کا اندازہ اس حدیث سے فرمائیں جس کے راوی ہیں سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جسے حضرات امام بخاری و مسلم قدس سرہما نے نقل کیا۔ (ترجمہ یہ ہے):

نبی مکرم، رسولِ رحمت نے فرمایا: حلال و حرام کا معاملہ تو واضح ہے (انمیں سے ہر ایک کا واضح بیان ہوگیا) البتہ ان کے درمیان ایک درجہ ہے وہ یہ کہ بعض اشیاء مشتبہ ہوتی ہیں، جنہیں بہت سے (چنگے بھلے) لوگ بھی نہیں جانتے۔ ان سے جو بچ گیا اس نے اپنے دین اور آبرو کی سلامتی کا سامان کر لیا اور جس نے ان کے معاملے میں احتیاط نہ برتی اور ان میں مبتلا ہوگیا، اس کا کھلے حرام میں بھی مبتلا ہونے کا خطرہ ہے (اس کی مثال دیتے ہوئے آپ نے فرمایا) کہ جیسے ایک بکریاں چرانے والا مخصوص چراگاہ کے اردگرد بکریاں چرا رہا ہو تو اس کا امکان ہے کہ اس کی بکریاں چراگاہ کے اندر تک پہنچ جائیں ــــ یاد رکھو کہ ہر بادشاہ کی مخصوص چراگاہ ہوتی ہے (جس میں داخلہ کی اجازت نہیں ہوتی) اللہ تعالیٰ جو احکم الحاکمین ہیں، ان کی چراگاہ اس کے حرام کردہ محارم ہیں (حرام کردہ چیزیں، جن سے بچنا لازم ہے) یاد رکھو انسانی جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ جب تک وہ درست ہوگا تو سارا جسم سلامت رہے گا، وہ فاسد ہو جائے گا تو پھر سارے جسم کا بگاڑ لازم ہے ــــ یاد رکھو وہ قلب ہے۔ (مشکوٰۃ ص۲۴۱)

اسی سلسلہ میں ایک اور حدیث ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ ہیں، حضور علیہ السلام کے ارشاد کا مطلب ہے کہ:

جب بنی آدم کوئی گناہ کا کام کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نشان (نقطہ) پڑ جاتا ہے توبہ و استغفار کے باعث وہ نقطہ دھل جاتا اور قلب صاف ہو جاتا ہے لیکن اگر توبہ نہ ہوئی اور گناہوں کا سلسلہ بڑھتا رہا تو وہ دل پر اس طرح غالب آجائیں گے کہ سارا دل سیاہ ہو جائے گا۔ اسی کیفیت کو "ران" سے تعبیر کیا گیا ہے (یہ اشارہ ہے سورۂ مطففین کی آیت ۱۴ کی طرف جسے حضور علیہ السلام نے یہاں تلاوت بھی فرمایا، اس کا ترجمہ ہے) "ہرگز نہیں بلکہ اُن کے (برے) کاموں سے ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے"

(احمد، ترمذی، ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ صـ۲۰۴)

اور ایک حدیث میں ہے:

یہ دل بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے لوہے پر پانی پڑنے سے وہ زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ اس پر صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عرض کیا: فما جلاء ھا یارسول اللہ۔ پھر ان دلوں کو صیقل کیسے جائے؟ تو جواب میں آپؐ نے ارشاد فرمایا: کثرۃ ذکر الموت وتلاوۃ القرآن:

رواہ حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنھما۔

(البیہقی فی شعب الایمان / مشکوٰۃ صـ۱۸۹)

آئینہ قلب کی صفائی ہو جائے اور انسان دولتِ احسان سے مالا مال ہو جائے اور اسے حضوریٔ قلب کی نعمت عظمیٰ میسر ہو تو پھر اس کا حال مجدد سرہندی قدس سرہٗ جیسا ہو جاتا ہے جو "خوف و رجاء" کی کیفیت کا شکار ہو کر جہاں اللہ تعالیٰ سے خیر کی امیدیں وابستہ رکھتے ہیں، وہاں یہ خطرہ بھی لاحق رہتا ہے کہ نہ معلوم انجام کیا ہوگا؟۔ ایسے حضرات کی نظر "الاعمال بالخواتیم" پر ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ "کافر فرنگ" سے نفرت کو بھی جرم گردانتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"معرفت حق بر آں کس حرام است کہ خود را از کافر فرنگ بہتر می گرداند"

اس کی وجہ یہی ہے کہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص عمر بھر کی خرابیوں کے باوجود آخری وقت میں کسی "خیر" سے مالا مال ہو کر بخشش کا مستحق ہو جائے اور ایک شخص ساری عمر بھلائیاں کر کر کے آخر میں بدنصیبی کا شکار ہو جائے جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس طرح کی ایک روایت نبی اکرم علیہ السلام سے نقل کی۔

بہرطور اس چیز کو محسوس کرنا ضروری ہے کہ ہماری سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ تعلق مع اللہ کی صحیح کیفیت حاصل ہو جائے، لیکن وائے افسوس کہ آج اسی سے ہم سب غافل ہیں اور بہت زیادہ! اس کے لئے محض کتابی مطالعہ اور تفکر و تدبر کافی نہ ہو تا بلکہ کسی "مزکی" اور "صاحب احسان" سے وابستگی بھی ایک طرح کی لازمی ضرورت ہے، اس کا احساس مولانا ثناء اللہ اور مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہما اللہ تعالیٰ جیسے اہل حدیث بزرگوں کو بھی تھا۔ جنہوں نے بعض لوگوں کو مولانا تھانوی سے اس سلسلہ میں رابطہ کا مشورہ دیا اور مولانا بٹالوی نے تو فرمایا کہ چالیس سال کے تجربہ کے بعد اس کی اہمیت و ضرورت **الم نشرح** ہو گئی، ہاں یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص سلاسل اربعہ میں سے کسی کا اہتمام کرے، اصل اہتمام اس کاوش کا چاہیئے! چنانچہ مولانا تھانوی ہی کے تذکرہ میں ہے کہ ایک اہل حدیث دوست ان سے بیعت ہوئے۔ حضرت کے بتلائے ہوئے معمولات بھی پورے کرتے، خدمت میں حاضری بھی دیتے لیکن انہوں نے عرض کیا کہ حضرت یہ سلاسل اربعہ میری سمجھ میں نہیں آتے، حضرت نے فرمایا، کوئی حرج نہیں ان کا سمجھنا بھی ضروری نہیں، ہاں اس لائن کو چھوڑنا صحیح نہیں۔ چنانچہ وہ باقاعدہ تعلق قائم کر کے سرگرم عمل رہے حضرت مولانا سید داؤد غزنوی قدس سرہٗ کے متعلق حتماً تو نہیں کہہ سکتا لیکن بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت الشیخ شاہ عبدالقادر رائپوری قدس سرہٗ سے باقاعدہ تعلق تھا۔

اس کی وجہ بقول ایک معرفت شناس یہ ہے کہ اصلاح کا کام دل کے ساتھ ہے۔ دل کی بیماریوں کا قصہ جسم کی بیماریوں کی طرح ہے، جسم کے علاج کے لئے معالج لازم ہے تو یہاں بھی لازم ہے۔ بلکہ جسم سے بڑھ کر، کیونکہ جسم کی بیماری کا بالعموم انسان کو خود بھی پتہ چل جاتا ہے لیکن دل کا معاملہ دگرگوں ہے۔

اس موقع پر مستری محمد صدیق صاحب بٹالوی مرحوم کے حوالہ سے ایک واقعہ بھی نقل کر دینا لازم ہے کہ مستری صاحب نے تبلیغی جماعت اور مولانا مودودی کے باہم اتحاد کی فکر کی، مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ و خادم مولانا احتشام الحسن کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس سلسلہ میں مولانا مودودی سے ملاقاتیں اور مولانا مودودی کا میوات کے تبلیغی سفر پر جانا ایک اہم واقعہ ہے، اس کے بعد مولانا مودودی نے اپنے رسالہ میں تبلیغی جماعت کے سلسلہ میں ایک نہایت ہی اچھا آرٹیکل لکھا۔ مولانا احتشام الحسن نے اسی موقع پر مولانا مودودی کی توجہ اس طرف دلائی کہ ذرا کسی شیخ سے رابطہ کریں۔ مولانا مودودی نے اس کو تسلیم کیا اور انہی سے مشورہ کیا تو انہوں نے بعض حضرات کے اسماء گرامی بتائے۔ جن میں سے دو بزرگوں مولانا رائے پوری اور شیخ الحدیث مولانا زکریا مہاجر مدنی رحمہما اللہ تعالیٰ میں سے ایک کے

ساتھ مولانا نے تعلق جوڑنے کی حامی بھر لی۔ لیکن افسوس کہ ان کے بعض جماعتی احباب نے انہیں ایسا نہ کرنے دیا، ایسا ہو جاتا تو ان کے کام کے برگ و بار کچھ اور ہی ہوتے۔ لیکن ہونا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے ـــــ اصل اس ضرورت کا احساس دلانا ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کے لئے اتنا کچھ کافی ہے

حرفِ آخر کے طور پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد نقل کرنا چاہتا ہوں جس میں آپؐ نے فرمایا:

اَمَرَنِیْ رَبِّیْ بِتِسْعٍ، خَشْیَۃُ اللّٰہِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَۃِ، وَکَلِمَۃُ الْعَدْلِ فِی الْغَضَبِ وَالرِّضَا، وَالْقَصْدُ فِی الْفَقْرِ وَالْغِنَا، وَاَنْ اَصِلَ مَنْ قَطَعَنِیْ، وَاُعْطِیَ مَنْ حَرَمَنِیْ، وَاَعْفُوَ عَنْ ظَلَمَنِیْ، وَاَنْ یَّکُوْنَ صَمْتِیْ فِکْرًا، وَنُطْقِیْ ذِکْرًا وَنَظَرِیْ عِبْرَۃً۔

یعنی میرے رب نے مجھے نو چیزوں کا حکم فرمایا: کھلے اور چھپے ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، غضب کی حالت ہو یا خوشی و رضا کی ہر حال میں انصاف کرنا۔ فقر کی حالت ہو یا امیری کی، راستی و اعتدال پر قائم رہنا، جو مجھ سے کٹے اس سے جوڑنا، جو مجھے محروم کرے اسے دینا، زیادتی کرنے والے کو معاف کرنا، یہ کہ میری خاموشی تفکر کی خاموشی ہو، میری گفتگو ذکرِ الٰہی کی گفتگو ہو اور میری نگاہ عبرت کی نگاہ ہو۔

ہمارا طالب علمانہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی علیہ السلام نے ان چند جملوں میں "احسان کی روح" ذکر فرما دی، رب کریم اپنے کرم بے پایاں سے ہمارے قلوب کی حالت درست فرما دے ان کی اصلاح کی بھرپور فکر کی ہمیں توفیق دے۔

اَللّٰھُمَّ مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰی دِیْنِکَ، اَللّٰھُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا اِلٰی طَاعَتِکَ

آمین، بحرمۃ النبی الکریم علیہ التحیۃ والتسلیم

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں ـــــ!

اُمّتِ مُسلمہ کے لیے لائحۂ عمل (آخری قسط)

(سُورۃ آلِ عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ کی روشنی میں)

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

اب آئیے پھر اسی حدیث کی طرف جس کا اختتام ہوتا ہے اس وعید پر : وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ ۔ یہ ہے نہی عن المنکر کی اہمیت ۔ وقت کی کمی کے باعث بڑی تیزی سے چند نکات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرا کے اپنی بات ختم کر دوں گا ۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان تینوں میں سے کون سا درجہ اختیار کیا! کیا صرف دل سے جہاد کیا! یا صرف زبان سے جہاد کیا! یا طاقت سے بھی کیا! ـــ سب سے اونچا درجہ تو طاقت کا ہے ۔ محمد رسول اللہؐ اور اُن کے صحابہ کرام رضؓ نے یہ جہاد طاقت سے کیا ۔ لیکن سمجھنے کی بات یہ ہے کہ طاقت سے کیسے کیا ؟ طاقت کا استعمال کس طور پر فرمایا ! بطور مفروضہ عرض کرتا ہوں کہ حضورؐ نے طاقت کا استعمال اس طرح نہیں کیا جب آپؐ نے دعوت شروع کی تو جو بیس پچیس سعید روحیں آپؐ پر ایمان لے آئی تھیں ، ان کا ایک چھوٹا سا جتھہ حضورؐ بناتے اور انہیں حکم دیتے کہ رات کی تاریکی میں چھپ چھپا کر جاؤ اور کعبہ شریف میں رکھے ہوئے سارے بت توڑ دو ۔ کر سکتے تھے یا نہیں ! ـــ کر سکتے تھے ، عملاً ممکن تھا ۔ وہاں کعبہ کی حفاظت کرنے کے لیے کوئی بریگیڈ آرمی اور مسلح پہرہ نہیں ہوتا تھا ۔ ایک مرتبہ جا کر صحابہ کرامؓ تمام بتوں کو توڑ سکتے تھے ۔ یہ مکہ میں سب سے بڑا منکر تھا کہ نہیں ؟ لیکن حضورؐ نے اسے برداشت کیا ۔ کیوں کیا ؟ اس لئے کہ پہلے ایک معتد بہ افراد کی ایک جمعیت فراہم کی جائے ۔ ایک طاقت فراہم کی جائے ، فدائین اور تربیت یافتہ جاں نثاروں کی ایک جماعت تشکیل دی جائے ۔ یہاں تربیت سے مراد عسکری تربیت نہ لیجیے گا ۔ اس سے مراد ہے روحانی و اخلاقی تربیت جس کے لئے ہمارے دین کی اصطلاح ہے تزکیہ ـــ ایک کام